مکاتیب

(۱)

مکرمی جناب پروفیسر میاں انعام الرحمٰن صاحب!

آپ پر سلامتی ہو!

ماہنامہ 'الشریعہ' جنوری ۲۰۰۶ء میں آپ کا فکر انگیز مضمون ''قرآنی علمیات اور معاصر مسلم رویہ'' پڑھا۔ یقین جانیے اس قسم کے مضامین کو میں اپنے لیے فکری غذا تصور کرتا ہوں۔ داخلی انتشار کے اس پرآشوب دور میں مسلم مذہبی فکر کے حوالے سے حق کی تلاش جتنی ضروری ہے، اسی قدر مشکل بھی ہے۔ گروہی اور مسلکی تعصّبات کے اندھیروں میں حق کے اجالے کی سحر شب گزیدہ بن گئی ہے۔ اس کے باوجود تلاش حق فرض عین ہے۔ اس عظیم سفر کی ہر تکلیف کلفت نہیں، نعمت ہے۔ اپنا یہ عقیدہ ہے کہ جادۂ مستقیم کا طالب ہر حال میں کامیاب ہے، خواہ اسے منزل نہ ملے۔ دوسرے لفظوں میں حق کی تلاش ہی اصل منزل ہے۔ زیر بحث مضمون کے بعض نکات سے اگرچہ مجھے اختلاف ہے، لیکن میں آپ کے ''سفر'' کو مبارک تصور کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اصابت اور لغزش، ہر دو صورتوں میں آپ کو اجر دے۔

قرآن کی علمیاتی اساس میں آپ نے غیب کی تشریح یوں کی ہے:

''یہاں غیب سے مراد 'نامعلوم' ہے، لیکن اس کا مطلب لاادریت بھی ہرگز نہیں۔ نامعلوم ہونا ایک اور چیز ہے اور نہ جان سکنا چیزے دیگر است۔ نہ جان سکنے کی روش اپنانا ایک منفی رویہ ہے اور یہ تشکیک کے قریب ترین ہے جس کی قرآن ابتدا ہی میں نفی کرتا ہے۔ اس کے برعکس نامعلوم ہونا ایک مثبت رویہ ہے جس میں جان سکنے کی خواہش اور یقین دونوں پائے جاتے ہیں۔''

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ بالغیب سے ''نامعلوم'' مراد لے کر ایمان بالغیب کا مطلب ''نامعلوم پر ایمان'' ہوگا، جیسا کہ آپ نے لکھا بھی ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 'بالغیب' پر داخل ''با'' کو ظرفیت کے مفہوم میں لینے کے بجائے آپ نے 'بالغیب' کو مفعول کیوں مان لیا ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ ایمان بالغیب سے ''نامعلوم پر ایمان'' مراد لے کر آیت میں اس کا مفہوم کیا بنتا ہے؟ اور تیسری بات یہ کہ خود ''نامعلوم'' کی وضاحت کیا ہے؟ یہاں میں تیسرے اور دوسرے سوال کی نوعیت پر بحث کرتا ہوں۔ نامعلوم کو غیب کا مترادف قرار دے کر آپ ایک سانس میں دو باتیں

کہہ ڈالتے ہیں۔ وہ یوں کہ غیب نامعلوم بھی ہے اور اس کا مطلب لاادریت بھی نہیں۔ آپ کے نامعلوم کا چہرہ کچھ کچھ ''ادریت'' کے غازے سے سرخ ہے۔ میرے خیال میں آپ اردو زبان کی تنگ دامنی کا گلہ کر رہے ہیں۔

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیان کے لیے

آپ کا یہ شکوہ اس وقت اور پرشکوہ لگتا ہے جب آپ لکھتے ہیں: ''نہ جان سکنے کی روش اپنانا ایک منفی رویہ ہے اور یہ تشکیک کے قریب ترین ہے۔'' (ایضاً ص ۲۰)

''سکنے'' کے لفظ سے ایک قسم کی معذوری ٹپکتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ رویہ کس طرح ایک منفی رویہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ اگر میں کچھ نہیں سیکھ سکتا تو میرا یہ رویہ منفی کس طرح ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ شاید ''نہ جاننے کی روش اپنانا'' اس مفہوم کے لیے درست تعبیر ہو۔ یوں لگتا ہے کہ آپ کی اس پیچیدگی نے آپ کو 'یومنون بالغیب' کا ترجمہ ''جو غیب پر ایمان لاتے ہیں'' کرنے پر مجبور کیا اور بعد میں آپ کو وضاحت کرنا پڑی کہ ''امکانات کو چھونے کو خواہش اور سکت ایمان بالغیب ہے۔'' اگر میں آپ کی بات سمجھ سکا ہوں تو غالباً آپ کا مطلب یہ ہے کہ آنے والے واقعات کے متعلق Positively سوچنا اور شک میں نہ مبتلا ہو جانا، ہی اس کا بالغیب ہے۔ آپ کے ایمان بالغیب کی یہ تعبیر صرف ''ایمان بالغیب'' میں مقید ہونے کا نتیجہ ہے، حالانکہ یہ ایک طرف اس سورۃ سے پہلی سورہ 'الفاتحہ' کے الفاظ 'الحمد اللہ رب العلمین الرحمٰن الرحیم ملک یوم الدین' کے ساتھ منسلک ہے تو دوسری جانب اس کا تعلق اسی سورہ میں مذکور ایمان کی تفصیلات و جزئیات سے ہے۔ میں یہاں صرف ایک مثال پیش کروں گا جو بنی اسرائیل کی ظاہر پرستی سے متعلق ہے: ''وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّى نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً'' (البقرہ، آیت ۵۵)

اس لیے ایمان بالغیب کا تعلق اللہ پر ایمان سے لے کر یوم آخرت تک، تمام چیزوں سے ہے۔ آپ کی بات بذات خود درست ہے، لیکن ایسا رویہ اپنانا متقین کی صفات میں سے ایک ہے، نہ کہ مجرد ایمان بالغیب کا تقاضا۔

قرآنی علمیات کے رہنمایانہ منہاج کے حوالے سے آپ نے حضرت آدمؑ اور فرشتوں کے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے، اس کا تعلق ایمان بالغیب کے اس تصور سے نہیں جسے آپ نے پیش کیا ہے۔ اس میں بھی آپ سے لغزش ہوئی ہے جس کی نشان دہی میں ابھی کروں گا۔ آپ یقیناً میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ یہ سورہ، بنی اسرائیل کے لیے ایک چارج شیٹ ہے اور اس میں ان پر فرد جرم عائد کی گئی ہے۔ حضرت آدمؑ اور فرشتوں کے اس واقعہ سے پہلے اور بعد میں بنی اسرائیل کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اٹھیک اس واقعے سے پہلے کی آیت یہ ہے: ''هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاء فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيم''۔ کیا فرشتوں والا Positive رویہ اپنانے کے لیے ضروری نہیں کہ سب سے پہلے ایمان بالغیب میں پوشیدہ اس عظیم المرتبت خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا جائے؟ مطلب یہ ہے کہ زندگی اور موت کے مسئلے پر غور کیا جائے اور کائنات کی تخلیق کے متعلق سوچا جائے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انسان اعتراف کر لے کہ اے خدا! میں نے اگرچہ تجھ کو نہیں دیکھا، لیکن میری عقل تسلیم کرتی ہے کہ تو ہی بلاشرکتِ غیرے اس کائنات کا رب ہے اور علم کے سارے خزانے تیرے ہی پاس ہیں۔

اب ذرا اس واقعے کے بعد کی آیات (۴۰، ۴۶) پر غور کیجیے۔ آیت ۴۰ میں بنی اسرائیل کو ''أَوْفُوا بِعَهْدِي'' یاد

دلایا گیا ہے۔ آیت ۴۱ میں اس چیز پر ایمان لانے کو کہا گیا ہے جسے خدائے عزوجل نے ''أَنزَلْتُ مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَكُمْ'' کہا ہے۔ آیت نمبر ۴۲ میں کتمان حق سے منع کیا گیا ہے۔ آیت نمبر ۴۳ میں نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے اور پھر آیت نمبر ۴۶ میں ''أَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ'' کی یاددہانی کرائی گئی ہے۔ میاں صاحب! بنی اسرائیل کو یہاں آیت ۴۰ تا ۴۶ میں براہ راست جو کچھ کہا جا رہا ہے، کیا یہی باتیں ان متقین کی صفات نہیں ہیں جن کا تذکرہ سورۃ البقرۃ کے بالکل ابتدائی آیات میں ہوا ہے: ''الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ o وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ''۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ان صفات کی حامل متقی شخصیت یہی ملکوتی رویہ اپنائے گی اور حق کے سامنے سرنگوں (Surrender) ہوگی۔

جیسا کہ میں نے پہلے اشارہ کیا، قرآنی علمیات کے رہنمایانہ منہاج میں آپ سے لغزش ہوئی ہے۔ رہنمایانہ منہاج کے لیے آپ نے حضرت آدمؑ اور فرشتوں کے واقعے سے متعلق آیات کا انتخاب کیا ہے۔ پہلی آیت یہ ہے:

''وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُواْ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاء وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ''

یہاں ایمان بالغیب کی تعبیر امکانات کو چھونے کی خواہش اور سکت کے نظریے سے Pre-Minded ہوتے ہوئے آپ نے لکھا ہے: ''خلیفہ کے بارے میں فرشتوں کی یہ جانکاری کی وہ زمین میں فساد اور خونریزی برپا کرے گا، خدا ہی کی عطا کردہ تھی۔'' (ایضاً ص ۲۱) اور اس کے لیے آپ نے آیت نمبر ۳۲ کے الفاظ ''لاَ عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا'' سے استدلال کیا ہے۔ اگر آیت نمبر ۳۰ میں ''إِنِّي أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ'' کے الفاظ نہ ہوتے تو آپ کا مذکورہ استدلال درست ہوتا۔ اس آیت سے صریحاً واضح ہے کہ فرشتوں نے لفظ ''خلیفہ'' کی بنا پر ایک امکانی بات کی جو ادھورے سچ کے مترادف تھی، یعنی وہ انسانی تخلیق کی مکمل اسکیم سے واقف نہیں تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ میں جانتا ہوں وہ کچھ جو تم نہیں جانتے۔ اگر اللہ نے فرشتوں کو بتا دیا تھا کہ انسان زمین میں فساد اور خون ریزی کرے گا جیسا کہ آپ نے لکھا ہے تو پھر ''إِنِّي أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ'' کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ شاید آپ اس کا جواب یہ دیں کہ انہیں انسان کے اسی خاص پہلو کے متعلق بتایا گیا تھا۔ میری گزارش ہوگی کہ اس مفروضے کی بنیاد کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ ان کے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہا تھا کہ آدھی بات بتا دی اور آدھی رہنے دی۔ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو زمین پر انسان کے خلیفہ بنائے جانے سے آگاہ کیا۔ 'خلیفہ' (یعنی صاحب اختیار) کے لفظ سے فرشتوں نے ایک امکانی بات اخذ کی جو معاملے کے سارے پہلوؤں کو محیط نہ تھی، یعنی یہ کہ یہ صاحب اختیار مخلوق زمین میں فساد برپا کرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اس کے بعد اللہ نے فرشتوں کے نہ جاننے کو جاننے میں تبدیل کرنے کے لیے پہلے حضرت آدمؑ کو ان کی ''صالح ذریت'' کی فہرست دکھائی (یا ان نیک بندوں کی صورتیں دکھائیں) پھر ان نیک بندوں کی بابت فرشتوں سے دریافت کیا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ان لوگوں کے متعلق، جو سب کے سب نیک اور متقی ہوں گے، تمھاری کیا رائے ہے؟ فرشتوں نے اللہ کی مکمل سکیم کی نوعیت کو سمجھنے سے معذوری ظاہر کی اور شک کرنے سے گریز کیا

اور کہا کہ اے خدا! جس امکانی بات کا علم تو نے ہمیں بخشا ہے، اسے کل سمجھتے ہوئے ہم نے ٹھوکر کھائی۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ امکانی بات کرنا بذات خود غلط نہیں، بلکہ اچھی چیز ہے لیکن مزید امکانات کا اندازہ کرنے کے بعد صرف اپنے ''امکانی علم'' پر ہٹ دھرمی اختیار کرنا اور اس پر اڑے رہنا غیر مستحسن رویہ ہے۔ اب اللہ نے حضرت آدمؑ سے کہا کہ ان لوگوں سے فرشتوں کا تعارف کرا دیں۔ اس کے بعد اللہ نے کہا کہ اب کہو، کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ غیب کا علم میرے پاس ہے، اور میں اس چیز کو بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔ (۲: ۳۳)

میاں صاحب! ''وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ'' کے بارے میں آپ کی رائے بہت صائب ہے یعنی یہ کہ ''اس وقت تک ابلیس نے اپنے انکار اور گھمنڈ کو چھپایا ہوا تھا''، لیکن اس آیت مبارکہ میں ''الاسماء'' سے علوم وفنون مراد لینا، جو قتل وخونریزی کو مغلوب کرنے والے ہوں گے، میرے خیال میں قرآن پاک کے Context کے خلاف ہے۔ آپ نے یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ ''الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا'' سے علوم وفنون مراد لینے کی کیا دلیل ہے؟ ان علوم وفنون کو ان امکانات تک پھیلانا جو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ فساد اور خونریزی کی نئی نئی صورتوں کے ظہور کے جواب میں مسیحائی کردار ادا کریں گے، ایک پرتکلف بات لگتی ہے۔ اگر آپ ''اسماء'' کے لیے استعمال کی جانے والی ضمائر پر غور کریں تو واضح ہوگا کہ اس سے مراد ذریت آدم ہی کے نام ہو سکتے ہیں۔

قرآنی علمیات سے روگردانی کے ضمن میں حضرت ابراہیمؑ اور قربانی کے واقعے کی بحث کافی فکر انگیز ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ذبیح اسماعیلؑ تھے یا اسحٰقؑ، آپ نے ''باپ کے فیضان نظر'' کا بہت پرحکمت مقام دریافت کیا ہے جس کا تعلق علم سے زیادہ متقین کے رویہ سے ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے دلائل کافی مضبوط اور دعوتی مزاج کے حامل ہیں۔ ابن ابراہیمؑ کے بجائے ابراہیمؑ ہی کی شخصیت کو نمایاں کرنا یہاں قرآن پاک کا مطمح نظر دکھائی دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ آپ ''مدبرین'' کی تحقیق وتفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے دعوتی مزاج کی بلندی کو برقرار نہ رکھ سکے۔ 'ذبیح کون' کی بحث کو امکانی فساد سے تعبیر کرنا میرے خیال میں ضرورت سے زیادہ سخت تبصرہ ہے۔ مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ نے فراہی مکتب فکر کو نسلی تفاخر جیسی بیماری میں مبتلا بتایا ہے جبکہ یار لوگ انھیں ''اغیار دوستی'' کا طعنہ دیتے ہیں۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

اللہ ہمیں پندار کا صنم کدہ ویراں کرنے اور حق کے کوئے ملامت کا طواف کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ کا خیر اندیش
یوسف خان جذاب
GHS، نار شکر اللہ، بنوں

(۲)

بخدمت گرامی قدر مخدومی حضرت علامہ زاہد الراشدی صاحب مدظلہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الشریعہ جنوری ۲۰۰۶ء کا شمارہ پڑھنے کا موقع ملا۔ ''آرا وافکار'' کے تحت محترم میاں انعام الرحمٰن صاحب کا مضمون پڑھا، بہت کوفت ہوئی۔ ابتدائی پانچ چھ صفحات لکھنے کے بعد میاں صاحب پٹڑی سے اتر گئے ہیں اور سارا زور قلم اس پر صرف کیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح قرار دینا قرآنی علمیات سے روگردانی ہے۔ انہوں نے سطحی قسم کی باتیں تحریر کر کے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح اللہ ماننے سے انکار کیا ہے۔ مزید فرمایا ہے کہ حضرت اسماعیل کو ذبیح ماننے سے معترضین کو پھبتی کسنے کا موقع ملتا ہے کہ اسلام دعویٰ تو عالمگیریت کا کرتا ہے، لیکن اصلاً اسماعیلی ہے۔ نیز یہ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح اللہ قرار دینا یہودیانہ رویہ ہے۔

مخدومی! یہ سمجھ نہیں آئی کہ میاں صاحب کو حضرت اسماعیل کو ذبیح اللہ قرار دینے پر اعتراض کیا ہے؟ اس سے دین اسلام کے وقار پر کیا حرف آتا ہے؟ اگر اقبال نے یہ کہہ دیا ''سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی'' تو کس جرم کا ارتکاب کیا ہے؟

محترم میاں صاحب کی خدمت میں عرض یہ ہے کہ مولانا فراہیؒ اور مفتی محمد شفیعؒ سمیت اکثر مفسرین نے ذبیح اللہ حضرت اسماعیل ہی کو قرار دیا ہے اور اس پر آثار وقرائن بھی ذکر کیے ہیں۔ وہ دور نہ جائیں، معارف القرآن ہی دیکھ لیں۔ آثار وقرائن حضرت اسماعیل ہی کو متعین کرتے ہیں اور اس سے اسلام کی عالمگیریت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ معترضین سے مرعوب ہو کر اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے سے انکار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت سلمان فارسیؓ پر کسی یہودی نے اعتراض کیا کہ سنا ہے تمھیں تمھارا پیغمبر ﷺ استنجا کرنے کا طریقہ بھی بتاتا ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے فخریہ طور پر کہا کہ ہاں، ہمیں انہوں نے استنجا کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ (جامع ترمذی) میاں صاحب سے معذرت کے ساتھ، اگر ان جیسا کوئی مرعوبیت کا شکار شخص ہوتا تو یہی کہتا کہ نہیں نہیں، خدا کی قسم! حضور ﷺ نے ہمیں کوئی ایسی بات ارشاد نہیں فرمائی۔ محترم میاں صاحب سے گزارش ہے کہ مستشرقین ودیگر کفار کے اعتراضات کے جواب میں گھبرا کر اپنا اصل موقف چھوڑ دینا اور یہود ونصاریٰ سے موافقت کے راستے تلاش کرنا دین کی کوئی خدمت نہیں ہے۔

میاں صاحب نے ''حرف آخر'' کے زیر عنوان ایک حدیث نقل کی ہے: ''اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب''۔ میرا ان سے سوال ہے کہ کیا حضور ﷺ کا یہ فرمان مطلق ہے یا اس میں کوئی قید بھی ہے؟ مفسرین اور محدثین کیا فرماتے ہیں؟ اگر وہ اس سوال کا جواب تلاش کریں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے موقف پر نظر ثانی پر مجبور ہو جائیں گے۔

میاں صاحب سے یہ بھی التماس ہے کہ آج کے دور میں فکری انتشار بہت زیادہ ہے، ایسے میں مزید انتشار پیدا کرنا، خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ ہو، دین کی کوئی خدمت نہیں ہے۔ اس سے احتراز فرمائیں۔ اور بے شک کم لکھیں، لیکن علمی پختگی کے ساتھ لکھیں۔ اپنے فکری انتشار پر پختہ فکر علما سے گفتگو کریں۔

مخدومی! آپ سے بھی گزارش ہے کہ آرا وافکار کے زیر عنوان فکری انتشار میں اضافہ کرنے والے مضامین شائع نہ کریں۔ حدود وقیود متعین فرمائیں۔ آپ کا یہ طرز فکر ''جماعت کو لازم پکڑو'' (الحدیث) کے منشا کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میاں صاحب کو کوئی بات ناگوار گزرے تو معذرت خواہ ہوں۔

(مولانا) مشتاق احمد

استاذ جامعہ عربیہ، چنیوٹ

(۳)

گرامی قدر نقوی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ میں تکفیر شیعہ پر جو بحث چل رہا ہے، اس میں میرے موقف پر آپ کا تبصرہ بصورت خط شائع ہوا ہے۔ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ:

۱۔ لاہور میں علامہ ڈاکٹر محمد حسین اکبر صاحب (ادارہ منہاج الحسین) سے میرا رابطہ تھا۔ ''الشریعہ'' میں مذکورہ مضمون لکھنے سے پیشتر میں کئی ماہ تک ان کو خط لکھتا اور فون کرتا رہا کہ جن تین امور کی وجہ سے مولانا سرفراز صفدر صاحب اور دیگر بعض سنی علما اہل تشیع کی تکفیر کرتے ہیں، اگر وہ وضاحت کر دیں کہ یہ سارے شیعہ کے اجتماعی مسائل نہیں ہیں تو میرا موقف مضبوط ہو جاتا کہ سارے اہل تشیع کی تکفیر نہیں کی جا سکتی، لیکن علامہ صاحب ٹالتے رہے اور انہوں نے جواب نہیں دیا اور بالآخر میں نے اس کے بغیر ہی مضمون ''الشریعہ'' کو بھجوا دیا۔ میری اب بھی یہ خواہش ہے کہ آپ اہل تشیع کا کوئی ذمہ دار عالم اس بات کی تصدیق کر دے تاکہ میرا کیس مضبوط ہو جائے۔ (یاد رہے کہ میرا یہ مضمون تھا اس مضمون پر جو اس سے پہلے شمارے میں مولانا زاہد الراشدی صاحب نے لکھا تھا اور جس میں مذکورہ تین نکات کا ذکر تھا)۔

۲۔ اگر آپ یہ کنفرم کر دیں کہ آپ کی جماعت کے پیش نظر پاکستان میں فقہ جعفریہ کا نفاذ نہیں تھا اور نہیں ہے بلکہ آپ اہل تشیع کے دیگر جائز قانونی حقوق کے لیے کوشاں تھے اور ہیں تو مجھے کیا پڑی ہے کہ اس موقف کو آپ کے سر منڈھوں جو درحقیقت آپ کا موقف نہیں ہے اور بقول آپ کے ایجنسیوں کا موقف ہے؟

۳۔ میں ایک سیدھا سادہ کھلے دل کا مسلمان ہوں اور کسی خاص مسلک سے وابستہ نہیں ہوں، بس طبیعت صلح جو ہے، اتحاد امت کا درد دل میں ہے کہ شیعہ سنی منافرت کم ہو جائے اور امت ایک دوسرے کے قریب آ جائے۔

والسلام۔ مخلص

(ڈاکٹر) محمد امین

سینئر ایڈیٹر، اردو دائرہ معارف اسلامیہ

جامعہ پنجاب۔ لاہور

(۴)

محترم جناب ڈاکٹر امین صاحب

السلام علیکم، مزاج گرامی

ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ میں آپ کے مضمون کی وضاحت میں ہمارے خط کی اشاعت کے بعد آپ کا گرامی

نامہ موصول ہوا۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ:

تکفیر کے ذیل میں آپ نے جو کچھ فرمایا، ہم نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ جن عقائد کو بنیاد بنا کر تکفیر کی بحث کی گئی ہے، وہ شیعہ عقائد کا حصہ نہیں ہیں۔ گزشتہ دو عشروں میں مرتب ہونے والے مختلف ضابطہ اخلاق، بالخصوص متحدہ مجلس عمل کے اعلامیہ وحدت، اسلام آباد میں ہماری شمولیت اس بات کی بین دلیل ہے کہ ہم ان مسائل میں واضح، روشن اور دوٹوک ہیں۔

اسی بنا پر ''شیعہ سنی تنازع کا حل'' کے ذیل میں تنازع کے وجوہ اور علل واسباب پر ہم نے عرض کیا تھا کہ ہمارے خلاف یہ موقف پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کی طرف سے جاری کیا گیا اور بعد میں سپاہ صحابہؓ کی زبان سے دہرایا جاتا رہا اور تاحال دہرایا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں آپ نے جن دو گروہوں کے برسر پیکار ہونے کا ابتدا میں ذکر کیا ہے اور آخر میں تحریر فرمایا ہے کہ ''اب دونوں گروہ ایک دوسرے کے آدمی مارے جا رہے ہیں''، بہتر ہوگا کہ ان دونوں گروہوں کی شناخت پر پوری توجہ دی جائے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو نقصان پہنچا دیا جائے اور پھر نادم ہونا پڑے۔

جہاں تک تحریک جعفریہ کے اہداف کا تعلق ہے تو شاید آپ تک ہمارا موقف نہیں پہنچ سکا۔ بارہا واضح کر چکے ہیں کہ تحریک نفاذ فقہ جعفریہ (تحریک جعفریہ) کا مقصد پاکستان کے تمام عوام پر فقہ جعفریہ کو مسلط کرنا ہرگز نہیں بلکہ آئینی دائرہ کار میں رہ کر پاکستان کے شیعہ عوام کے لیے فقہ جعفریہ کا نفاذ اور ان کے قانونی حقوق کا تحفظ ہی ہدف ہے۔

وحدت امت کے قیام اور شیعہ سنی منافرت کے خاتمے کے حوالے سے آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، ہم انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ کی جدوجہد لائق تحسین ہے۔ ہم سنجیدہ اور متین کوششوں پر تعاون پر آمادہ ہیں۔

نیک خواہشات کے ساتھ

والسلام

سید عبد الجلیل نقوی

مسئول روابط

قائد تحریک نفاذ فقہ جعفریہ

(۵)

محترم ومکرم حضرت مولانا دامت الطافکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

.....

میں تقریباً تین ماہ کے بعد گزشتہ ہفتہ لندن واپس پہنچا ہوں۔ ''ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق'' کے مطابق آنے کے ساتھ ہی ڈنمارک کی چھوڑی ہوئی پھلجڑی کا منحوس نظارہ ہے۔ اور پھر وہی ردعمل جس کے بارے میں اس بار تو ذرا شبہہ کی گنجایش نہ ہونی چاہیے تھی کہ عمل سے مقصود ہی اس ردعمل کا حصول ہے۔ سب سے زیادہ افسوس حماس کے پایہ تخت غزہ کے ردعمل کا ہے اور جس طرح وہاں کے ردعمل کی خبروں کو نمایاں تر کیا جا رہا ہے، اس سے تو ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے عمل کا اصل

نشانہ فلسطین ہی تھا۔ اور وہ کامیاب رہا۔

.....

(مولانا) عتیق الرحمٰن (سنبھلی)

لندن

(۶)

گزشتہ دنوں ماہنامہ ''الشریعہ'' فروری ۲۰۰۶ء کا شمارہ موصول ہوا۔ جناب پروفیسر اکرم ورک صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے دعاؤں میں یاد رکھا اور مجھے اعزازی شمارہ ارسال کیا۔ اسا ل اللہ لہ کل مایحبہّ و یرضاہ۔

یوسف خان جذاب کا مضمون پسند آیا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ''ماہنامہ الشریعہ اور جناب جاوید احمد غامدی'' کے نام سے جو مضمون آصف محمود ایڈووکیٹ صاحب نے تحریر کیا ہے، اس میں انہوں نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ ''شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور'' کے مصداق ہمیں بلا جواز تنقید نہیں کرنی چاہیے۔ جاوید احمد غامدی صاحب کے جو افکار ونظریات ہیں، وہ اسلاف میں بہت سے بزرگوں کے بھی رہے ہیں، اس لیے غلام احمد قادیانی کے ساتھ ان کی مطابقت اور مماثلت کے حوالے سے گفتگو کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ فاضل دوست کی یہ مثبت سوچ ہے، لیکن ساتھ ہی انہوں نے حدود آرڈیننس کو ''صحیفہ جہالت'' قرار دیا ہے۔ قانون کے ماہر کے لیے ایسی سخت زبان استعمال کرنا ناقابل فہم ہے۔ میں اپنے فاضل دوست سے بحیثیت مجموعی اتفاق کرتا ہوں، تاہم ایک نقاد کا فرض بنتا ہے کہ جب وہ کسی فکر اور زاویہ نگاہ کو تنقید کا نشانہ بنائے تو پہلے دیانت دارانہ طریقے سے اس فکر کی وضاحت کرے اور پھر دلائل کی روشنی میں اس کی درستی یا نادرستی کو واضح کرے۔ فاضل دوست کے مذکورہ الفاظ ایک غیر علمی اور غیر سنجیدہ رویہ پر دلالت کرتے ہیں۔ حدود آرڈیننس میں جہاں کہیں سقم پایا جاتا ہے، اگر فاضل دوست ان مقامات کی نشاندہی کرتے اور اس میں حذف واضافہ تجویز کرتے تو یہ ان کی علمی خدمت ہوتی۔ ماہنامہ 'الشریعہ' کی وساطت سے فاضل دوست اگر اب بھی اس سلسلے کو شروع کریں اور حدود آرڈیننس کی تمام دفعات کا قرآن وسنت کی روشنی میں شرعی جائزہ لے کر واضح کر دیں تو راقم الحروف اور دیگر احباب ان کے ممنون ہوں گے۔

عبد الغفار

لیکچرر اسلامیات